محمد بلال

توہینِ مذہب اور ہمارا رویہ

اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ قانون شکنی پر سزا کا خوف انسان کو اپنے جذبات قابو میں رکھنے پر مجبور کرتا ہے، لیکن اگر اس کا محرک مذہبی جذبات ہوں تو پھر، بسا اوقات، سخت سے سخت حتیٰ کہ موت کی سزا بھی اس کی راہ میں حائل نہیں ہوتی۔ اس صورت حال میں انسان اس قدر جذباتی ہو جاتا ہے کہ وہ ہر دیوار گرا دیتا اور ہر زنجیر توڑ دیتا ہے۔

مذہبی جذباتیت کو حدود آشنا رکھنے کے لیے آئین و قوانین اور تادیب و تنبیہ کی بھی بڑی اہمیت ہے، لیکن اس معاملے میں دعوت و تبلیغ اور تعلیم و تربیت کو ہمیشہ مقدم ہونا چاہیے، مگر ہماری حکومتوں کے نزدیک بالعموم، قانون سازی ہی ترجیح اول ہوتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں مذہبی فسادات کی آگ اکثر و بیشتر بھڑکتی رہتی ہے۔

مذہب ایک ایسی چیز ہے جس کا صحیح تصور، مہر و محبت، امن و راحت اور خیر و سلامتی کا باعث بنتا ہے اور اس کا غلط تصور، بسا اوقات نفرت و عداوت، بد نظمی و بے چینی اور تباہی و بربادی کی وجہ بن جاتا ہے۔ اس لیے حکومت کو مذہب کے صحیح تصور کی تحقیق و جستجو کے لیے سرگرم ہونا چاہیے، مگر دیکھنے میں آتا ہے کہ حکومت کے نزدیک یہ مسئلہ سرے سے کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔

پچھلے دنوں مسیحی حضرات کی اکثریت پر مشتمل ایک بستی، شانتی نگر میں، ایک انتہائی درد انگیز واقعہ رونما ہوا۔ اخبارات اور جرائد میں اس واقعہ سے متعلق مختلف باتیں لکھی گئی ہیں۔ ان میں سے ایک بات یہ ہے کہ شانتی نگر کے ایک عیسائی نے قرآن مجید کی بے حرمتی کی، جس کی سزا دیتے ہوئے مسلمانوں نے اس بستی کو آگ لگا دی جس میں گھروں ہی کو نہیں، بلکہ گرجا گھروں، اسکولوں، ہسپتالوں اور بائبل کے بہت سے نسخوں کو بھی جلا دیا گیا۔ دوسری بات یہ کہی گئی کہ کسی عیسائی نے قرآن مجید کی بے حرمتی نہیں کی، بلکہ مقامی پولیس کے افسران اس بستی کے کچھ لوگوں سے ذاتی رنجش رکھتے تھے، لہذا پولیس نے ایک خاص انتقامی کارروائی کرتے ہوئے قرآن مجید کی بے حرمتی کا سوانگ رچایا اور مسلمانوں کو مشتعل کر کے اس بستی کو تباہ و برباد کروا دیا۔ تیسری بات یہ کہی گئی کہ یہ غیر ملکی دشمنوں کی کارستانی ہے۔

اصل مجرم کون ہے؟ ہم یہ معاملہ عدالت پر چھوڑتے ہوئے، اس واقعہ کے دوسرے پہلوؤں کا تجزیہ کرتے ہیں۔ دراصل یہ پہلو اتنے اہم ہیں کہ اگر ہم نے ان کی جانب توجہ نہ کی، تو اندیشہ ہے کہ

ایسے واقعات رونما ہوتے رہیں گے۔

اس واقعہ کے بعد اقلیتی حق پرست پارٹی کے چیئرمین جناب پطرس غنی نے کہا ہے کہ توہینِ مذہب کا قانون ختم کر دینا چاہیے جو کہ شانتی نگر کے واقعہ کی طرح فرقہ وارانہ تصادم کا باعث بنتا ہے۔

ہم پطرس غنی صاحب سے بصد احترام اختلاف کرتے ہوئے یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ شانتی نگر جیسے واقعات کی وجہ اصلاً ایسے قوانین نہیں ہیں، بلکہ ان کے پیچھے بالعموم تعلیم و تربیت کی کمی اور مذہبی فکر کی غلطی کار فرما ہوتی ہے۔ ایسے قوانین کی وجہ سے تو بہت سے لوگ ایسا مسئلہ قانون نافذ کرنے والے اداروں کے ذریعے سے حل کرتے ہیں، اور پھر عدالتوں میں بے جا جذباتیت سے پاک اور عدل و انصاف کے تقاضوں کو سمجھنے والے جج صاحبان معاملہ کرتے ہیں اور بعض اوقات ایسے ملزم کو، جرم ثابت نہ ہونے پر، باعزت بری بھی کر دیتے ہیں۔ اگر ایسے قوانین نہ ہوں تو مشتعل لوگ جھگڑا خود نمٹائیں گے اور گروہی نفسیات کا علم رکھنے والے جانتے ہیں کہ پھر لازماً ان سے زیادتی بھی ہو جائے گی۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جب کوئی شخص ربِ کائنات، انبیاء و رسل اور الہامی کتب کے وقار اور تقدس کو مجروح کرتا ہے تو مذہبی شخص غیظ و غم سے تڑپ اٹھتا ہے، اس کے جذبات بے قابو ہو جاتے ہیں اور اس کا جی چاہتا ہے کہ اس گستاخ کے وجود سے اس زمین کو پاک کر دے، مگر کیا کریں، اسی ربِ کائنات نے، انہی انبیاء و رسل نے، انہیں الہامی کتب نے ہمیں یہ تعلیم دی ہے کہ ہم ایسے معاملات میں قانون کو اپنے ہاتھ میں نہ لیں اور دین کی محبت میں دین کی خلاف ورزی نہ کریں۔

ہم جانتے ہیں کہ بیت اللہ، محمد عربی اور قرآن مجید کا مقام و مرتبہ کیا ہے، لیکن دیکھیے، عہد رسالت مآب ﷺ میں بیت اللہ، بت کدہ بنا ہوا تھا۔ برہنہ لوگ سیٹیاں بجاتے اور تالیاں پیٹتے اس کا طواف کیا کرتے تھے۔ نبی کریم ﷺ کو مجنون اور دیوانہ کہا جاتا تھا۔ آپ کو پتھر مارے جاتے اور آپ کے راستے میں کانٹے بچھا دیے جاتے تھے، حتیٰ کہ آپ کو جان سے مار دینے کے لیے آپ پر حملے بھی کیے جاتے تھے۔ قرآن مجید کو کاہنوں کا القاء، جنوں کا الہام اور ایک من گھڑت کلام قرار دیا جاتا تھا۔ دینِ حق کو قبول کرنے والوں کے پیٹ پھاڑ دیے جاتے تھے اور انہیں تپتی ریت اور دہکتے انگاروں پر لٹا دیا جاتا تھا۔

لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ نبی کریم کے ساتھی، جو آپ کے اشارۂ ابرو پر، بیت اللہ کی حرمت، آپ کی عزت اور قرآن کے تقدس کے لیے نہ جان لینے سے گریز کر سکتے تھے اور نہ جان دینے سے، وہ ان کافروں اور گستاخوں کے خلاف کوئی جارحانہ کارروائی نہیں کرتے اور کسی کو کوئی سزا نہیں دیتے۔ یہ وہ ہستیاں تھیں جنہیں صحابہ کرامؓ کہا جاتا ہے۔ جی ہاں وہ ہستیاں، جنہیں زمین ہی پر اللہ تعالیٰ نے جنت کی بشارت دے دی۔ وہ ہستیاں، جن کی عظمت کو چھونے کا کوئی مسلمان، تصور بھی نہیں کر سکتا۔

نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرامؓ کے اس ضبط و تحمل اور عدم جارحیت کی کیا وجہ تھی؟ اس کا جواب یہ

ہے کہ اس وقت مکہ میں مسلمانوں کی کوئی حکومت قائم نہیں ہوئی تھی اور جرائم کی سزا دینا صرف اور صرف حکومت ہی کا حق ہے۔ ہمارے معاشرے میں یہ نہیں ہوتا کہ علماء یا عام لوگ کسی چور کو پکڑ کر اس کے ہاتھ کاٹ دیں یا کسی زانی کو پکڑ کر اسے کوڑے مارنا شروع کر دیں۔ حالاں کہ بسا اوقات زانی ان کے سامنے ہوتا ہے اور چور ان کی گرفت میں۔ اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ جرائم کی سزا دینے کے احکام مدینہ میں نازل ہوئے تھے جہاں اسلامی ریاست قائم ہو چکی تھی۔ اس لیے ایسے احکام کے مخاطب حکمران ہیں۔ یہ ایک بہت اہم مسئلہ ہے۔ قرآن مجید میں سورتوں کے اوپر مکی اور مدنی لکھنے کا اتنا اہتمام اسی لیے کیا جاتا ہے اور جید اہل علم فتح مکہ کے بعد مکہ میں نازل ہونے والی آیات کو بھی اسی لیے مدنی قرار دے دیتے ہیں تاکہ مکی اور مدنی سورتوں کے پیچھے کارفرما اصول واضح رہے۔ بصورت دیگر یہ ہوگا کہ حکمران کا کام عوام کرنا شروع کر دیں گے اور معاشرے میں انارکی کی صورت پیدا ہو جائے گی۔

لیکن ہمارے ہاں قوانینِ مذہب کے جو واقعات رونما ہوتے ہیں، ان میں ملزم واقعتہً مجرم ہے یا نہیں، یہ ابھی ثابت بھی نہیں ہوا ہوتا کہ لوگ فوراً اشتعال میں آجاتے، وہ ملزم کو خود ہی سزا دینے کے درپے ہو جاتے ہیں اور مولوی صاحبان آگ پر تیل کا کام کرتے ہیں۔ پھر غم و غصہ سے بھرا ہوا مشتعل ہجوم ملزم کو پکڑتا، اسے جان سے مارتا اور اس کی لاش کو سڑکوں پر گھسیٹتا ہے۔ انہیں اطلاع ملتی ہے کہ عیسائیوں کی ایک بستی کے ایک آدمی نے قرآن مجید کی بے حرمتی کی ہے تو وہ اس بستی کے گھروں، عبادت گاہوں، اسکولوں اور ہسپتالوں کو آگ لگا دیتے ہیں، حالاں کہ اس بستی میں مسلمان بھی رہتے ہیں۔ اگر اس بستی کی عیسائی اکثریت انتقامی کارروائی کرتے ہوئے ان پر حملہ آور ہو جاتی، ان کے گھروں اور مسجد کو آگ لگا دیتی اور اس کے بعد جو ملک گیر فسادات ہوتے، جسے قرآن مجید فساد فی الارض قرار دیتا ہے، اس کا ذمہ دار کس کو ٹھہرایا جاتا؟

لاریب، اللہ و رسول کی مقرر کی ہوئی شرائط کو بالائے طاق رکھ کر، کیے گئے کسی کام سے کبھی خیر و فلاح نہیں، بلکہ ہمیشہ تخریب و غارت گری جنم لے گی۔ اس سے کبھی عدل و انصاف نہیں، بلکہ ہمیشہ ظلم و عدوان برآمد ہوگا۔ یہ کبھی نیکی و تقویٰ نہیں، بلکہ اللہ کے نزدیک، جہل و ضلالت ہی قرار پائے گا۔

اس موقع پر اس امر کی وضاحت بے حد ضروری ہے کہ علماء کا کام قانون بتانا ہوتا ہے، قانون نافذ کرنا نہیں۔ وہ یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ فلاں قسم کے جرم کی سزا قتل ہے، لیکن وہ یہ نہیں کہہ سکتے کہ فلاں شخص کو قتل کر دیا جائے۔ دین و شریعت میں یہ بات قطعی ہے کہ کسی ملزم کو مجرم قرار دینا اور اس کے جرم کی سزا دینا اجتماعی نظم کا کام ہے۔ اس ضمن میں جناب جاوید احمد غامدی لکھتے ہیں:

> (سزاؤں) کے نفاذ کے لیے دارالاسلام اور اس میں ایک باقاعدہ حکومت کا قیام شرط ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ ان کا حکم ہی قرآن مجید کی ان سورتوں میں بیان ہوا ہے، جو اس وقت نازل ہوئی ہیں جب یثرب کا اقتدار رسول اللہ ﷺ کو منتقل ہو چکا تھا اور ایک

باقاعدہ اسلامی حکومت وہاں قائم ہو گئی تھی۔ چنانچہ کوئی شخص یا جماعت، اگر کسی خطہ ارض میں سیاسی اقتدار نہیں رکھتی، تو اسے ہرگز یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ ان میں سے کوئی سزا کسی مجرم پر نافذ کرے، قرآن مجید کے عرف فاجلدوا اور فاقطعوا کے مخاطب ہی مسلمانوں کے امراء اور حکام ہیں۔ عام مسلمانوں کو ان احکام کا مخاطب کسی طرح قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ابوبکر جصاص اپنی کتاب "احکام القرآن" میں لکھتے ہیں:

وقد علم من قراء سمعہ ھذا الخطاب من اھل العلم ان المخاطبین بذلک ھم الائمہ دون عامتہ الناس، فکان تقدیرہ، فلیقطع الائمہ و الحکام ایدیھما ولیجلدھما الائمہ والحکام (ج ۳، ص ۲۸۳)

[ترجمہ] "اہل علم میں سے جو شخص بھی، اس خطاب کو سنتا، فوراً سمجھ لیتا ہے کہ اس کے مخاطب عام مسلمان نہیں، بلکہ ان کے ائمہ و حکام ہیں۔ چنانچہ اس میں، مثال کے طور پر، تقدیر کلام یہی مانی جاتی ہے کہ پس چاہیے کہ امراء و حکام ان کے ہاتھ کاٹ دیں اور چاہیے کہ امراء و حکام ان کی پیٹھ پر تازیانے برسا دیں۔ (حدود و تعزیرات، ص ۵۰-۵۱)

اب اس مسئلے کو ایک دوسری جہت سے دیکھیے، جب کوئی شخص توہین مذہب کا ارتکاب کرتا ہے تو اس وقت دو رویے اختیار کیے جا سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ پولیس اور انتظامیہ کو اطلاع دے دی جائے۔ دوسرے یہ کہ حکمت اور دلیل کے ساتھ اس بے ادب کی اصلاح کی جائے۔ اس سے عین ممکن ہے کہ وہ شخص ایک عظیم گناہ اور بڑے جرم کے ساتھ قتل ہونے کے بجائے، ایک سچا مسلمان بن جائے۔

اگر ٹھنڈے دل سے سوچیے تو یہ دوسرا رویہ پیغمبرانہ رویہ ہے۔ غور کیجیے، کڑی دھوپ میں جھلسنے کے بجائے، پیٹر لگانا بہتر ہے۔ گمراہ کو دھتکارنے کے بجائے، راہ راست پر لے آنا، بہتر ہے۔ گستاخ کو قتل کر دینے کے بجائے، با ادب بنا دینا، بہتر ہے۔ دوزخی کو پکا دوزخی بنا دینے کے بجائے، اسے جنتی بنا دینا بہتر ہے۔

ہر دل دردمند پریشان ہے کہ آخر ہمارا انداز نظر رجائی کیوں نہیں ہے، ہم اللہ اور رسول کی نافرمانی کرتے ہوئے، یہ بدگمانی کیوں کرتے ہیں کہ فلاں شخص سمجھانے پر نہیں سمجھے گا اور دعوت دینے پر نہیں بدلے گا؟ ہمیں یہ جان لینا چاہیے کہ اندھیرا روشنی کے مدہم ہونے پر ہوتا ہے، نہ کہ اپنے بل بوتے پر۔ دیکھ لیجیے فساد فی الارض کی سزاؤں کو بیان کرنے کے بعد رحمٰن و رحیم نے یہ بھی فرمایا ہے:

مگر جو لوگ توبہ کر لیں، اس سے پہلے کہ تم ان پر قابو پاؤ (یعنی حکومت کے افراد ایسے مجرموں کو گرفتار کر لیں) تو سمجھ لو کہ اللہ مغفرت فرمانے والا ہے۔ اس کی شفقت ابدی

ہے۔ (المائدہ ۵:۳۴)

یہاں یہ واضح کر دینا بھی بے محل نہ ہوگا کہ ایک اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک معاہد اور دوسرے ذمی۔ معاہد وہ غیر مسلم ہوتے ہیں جنھوں نے اسلامی حکومت کے خلاف جنگ نہ کی ہو یا شکست نہ کھائی ہو، بلکہ کسی اور وجہ سے، اپنے مصالح و مفاد کو پیش نظر رکھ کر، ایک معاہدے کے تحت اپنے آپ کو، اس کی ماتحتی میں دے دیا ہو۔ ہمارے ملک میں غیر مسلموں کی حیثیت معاہدین کی ہے۔ مسیحی حضرات کے جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت حکومتِ پاکستان اور ایک لحاظ سے ہر پاکستانی کی ذمہ داری ہے۔

لہٰذا وہ لوگ جنھوں نے شانتی نگر میں بے قصور عیسائیوں کی جان اور مال پر حملہ کیا اور وہ پولیس، جو اس زیادتی کو روکنے کی ذمہ دار تھی، وہ خاموش تماشائی بنی رہی، وہ اس استغاثہ کے لیے تیار رہے، جو رسول اللہ نے قیامت کے روز، اللہ کی عدالت میں، ان کے خلاف دائر کرنا ہے۔ فرمان نبوی ﷺ ہے:

> خبردار، جو شخص کسی معاہد پر ظلم کرے گا یا اس کے حقوق میں کمی کرے گا یا اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ اس پر ڈالے گا یا اس کی رضامندی کے بغیر کوئی چیز اس سے لے گا، اس کے خلاف قیامت کے دن میں خود استغاثہ کروں گا۔ (ابوداؤد، کتاب الجہاد)

اسی طرح یہ بھی نبی ﷺ کا ارشاد ہے:

> جو کسی معاہد کو قتل کرے گا، اسے جنت کی بُو تک نصیب نہ ہوگی، حالانکہ اس کی خوشبو ۴۰ برس کی مسافت سے بھی محسوس ہوتی ہے۔ (بخاری، کتاب الدیات)

شانتی نگر کے بے گناہ معاہدین پر ظلم کرنے والوں سے ہماری یہ درخواست ہے کہ وہ مسئلے کی سنگینی کو سمجھیں۔ اس سے پہلے کہ زندگی کا آخری سانس آ جائے۔ اس سے پہلے کہ قیامت کا وہ بڑا ہنگامہ برپا ہو اور آسمان کی کھال کھینچ لی جائے۔ اور پہاڑ چلا دیے جائیں اور دوزخ دہکائی جائے۔ وہ ندامت کے آنسو بہالیں، اللہ سے معافی کے لیے گڑگڑالیں اور ان مظلوموں سے معذرت کر کے، ان کے نقصان کی تلافی کر دیں۔ یہ ان کے لیے بہتر ہے، بلکہ یہی ان کے لیے ضروری ہے، اگر وہ سمجھیں۔

(ماہنامہ "اشراق" - لاہور، مئی ۱۹۹۷ء)

حواشی

۱۔ روزنامہ "دی نیوز"، ۱۷ مارچ ۱۹۹۷ء

۲۔ یعنی یہ بات کلام میں مضمر ہے، گو لفظ میں نہیں آئی، لیکن یہ بات یہاں موجود ہے۔